رشید احمدؒ (جالندھری)

امت مسلمہ اور دور حاضر میں اس کا کردار

آج کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی امت مسلمہ مختلف زبانوں، نسلوں اور ملکوں سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کئی ملکوں میں اکثریت میں ہے۔ جہاں وہ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک صحت مند اور مؤثر کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں ہے اور بعض ملکوں میں وہ اقلیت میں ہے۔ جہاں وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ مل کر اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اپنے پاس علم، ٹیکنالوجی اور مقصد رکھتی ہو۔

زبان، نسل اور وطن کے اختلاف کی وجہ سے ہر ملک کی مسلم جماعت شعر و ادب، ثقافت و تمدن، رہن سہن اور رسم و رواج میں اپنا ایک خاص تشخص اور روایات رکھتی ہے۔ لیکن اس اختلاف، تعدد اور تنوع کے باوجود یہ کہنا صحیح ہو گا کہ روئے زمین پر بسنے والی امت مسلمہ اس بات کا بھی گہرا شعور رکھتی ہے کہ اس کے کلچر اور تمدن کی بنیادی قدریں ایک ہیں۔ وہ توحید اور دوسری زندگی (حیات بعد الموت) پر ایمان کے ساتھ ساتھ اخوت، مساوات اور حریت کو زندگی کی بنیادی قدریں تصور کرتی ہے۔ چنانچہ اپنی تاریخ کے عہد آغاز

سے لے کر آج تک اس کے دل کی گہرائیوں میں امت کی وحدت کا سوال برابر اٹھتا رہا ہے اور وہ اپنی ثقافتی کثرت میں جاری و ساری وحدت کا عملی مظاہرہ دیکھنے کے لئے ہمیشہ بے تاب رہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امت' تاریخ کی اس تلخ حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ اس کی سیاسی وحدت کی راہ داخلی اور خارجی مشکلات سے بھری پڑی ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دور حاضر میں سیاست کا وطن اور جغرافیائی سرحدوں سے گہرا تعلق ہے' چنانچہ وطنی و قومی سیاست کے نئے انتظامی قوانین کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً اگر ایک ملک میں مسلمان اقلیت میں ہیں تو وہ اپنے پڑوسی مسلم ملک سے تعلقات کو بہتر بنانے میں اپنا کردار تو ادا کرسکتے ہیں یا اپنے ملک کی برسراقتدار سیاسی جماعت کے کسی سیاسی فیصلے سے اختلاف بھی کرسکتے ہیں' لیکن اپنی ریاست کے مجموعی مفاد کے خلاف وہ کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔

گزشتہ صدی کے آخر میں امت کے رہنماؤں اور دانش وروں کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ امت اپنی ہی سرزمین میں غیر ملکی سامراج کی غلام بن کر رہ گئی ہے اور اس کی بنیادی ذمہ داری خود اسی پر عائد ہوتی ہے۔ چانچہ امت کے زوال و انحطاط پر مسلم دانش ور برابر سوچ بچار کرتے رہے اور "ان کی زندگی کی راتیں اسی پیچ و تاب میں گزریں" کہ آخر امت مسلمہ تاریخ کے سٹیج سے پیچھے کیوں دھکیل دی گئی ہے نیز یہ کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام کیوں کر حاصل کرسکتی ہے؟ امت کے زوال و انحطاط کے متعلق ایک دل چسپ بحث کو ہم معروف عرب دانش مند عبدالرحمان الکواکبی کی کتاب "ام القریٰ" میں پڑھ سکتے ہیں۔

یہ کتاب دراصل مکہ مکرمہ میں ایک عالمی مسلم کانفرنس کی روئداد ہے' جس کے اجلاس فاضل مولف الکواکبی کے نہاں خانہ دماغ میں منعقد ہوتے

رہے ہیں۔ اس اجتماع مین عرب' ترک' ایرانی' سندھی' ہندوستانی' نمائندے شریک ہوئے اور ہر ایک نے امت کے زوال پر پر مغز تقریریں کیں۔

کانفرنس نے اپنے ساتویں اجلاس میں جو ۲۴ر ذی القعدہ ۱۳۱۲ھ کو منعقد ہوا' طے کیا کہ زوال امت کے اسباب دینی' سیاسی اور اخلاقی ہیں۔

دینی اسباب

۱۔ دینی اسباب کے تذکرہ میں کہا گیا کہ دین کی رواداری اور یسر و آسانی سے تغافل برتا گیا۔

۲۔ فقہائے متاخرین نے سلف کے برعکس شدت اور سختی سے کام لیا۔

۳۔ جاہل علماء کے ہاتھوں دین میں اسرائیلی روایات اور خرافات کا اضافہ ہوا۔

۴۔ فلسفیانہ علوم کو دین کے منافی قرار دیا گیا۔

۵۔ قرآن و سنت اور سلف سے اعراض کر کے فقہاء متاخرین کی آراء کو ترجیح دی گئی۔

۶۔ جماعت' جمعہ اور حج کی حکمت و فلسفہ سے غفلت برتی گئی۔

۷۔ دینی آزادی کو ترک کیا گیا۔

سیاسی اسباب

۱۔ مکمل استبداد و تسلط۔

۲۔ آزادی رائے اور عمل سے محرومی۔

۳۔ امت کے مختلف طبقات کے حقوق میں عدل و انصاف کا فقدان۔

۴۔ اس اصول کو بدل دیا گیا کہ اغنیا سے رقم وصول کر کے غریب طبقہ میں تقسیم کی جائے۔

۵۔ امراء اور حکام نے مفتی اور قاضی حضرات سے ایسے امور سرزد کرائے

جن سے دین کی بنیاد منہدم ہوتی ہے۔

اخلاق

۱۔ مایوسی اور یہ خیال کہ دین و دنیا میں کامیاب لوگوں کی پیروی مشکل ہے۔
۲۔ نفس کی تسکین کے لئے زاویہ نشینی۔
۳۔ تعلیم اور وعظ و ارشاد میں بگاڑ۔
۴۔ دینی اور اخلاقی تعلیم کا خاتمہ۔
۵۔ اخلاق پر تملق اور خوشامد کا غلبہ۔
۶۔ کسب معاش کے لئے فوجی اور حکام کی خدمت کو صنعت و حرفت سے بہتر گردانا۔
۷۔ یہ وہم کہ دین کا علم بڑے بڑے عماموں اور کتابوں میں بند ہے۔
۸۔ نادانی و جہالت سے اعلیٰ علوم کی مخالفت۔
۹۔ امور عامہ میں باہمی گفت و شنید سے احتراز۔

گزشتہ صدی میں سلطان عبدالحمید نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے وحدت اسلامیہ کا نعرہ لگایا۔ اس تحریک کے ساتھ جمال الدین افغانی بھی منسلک تھے' اس تحریک کے بارے میں ۱۹۰۴ میں مصر میں لارڈ کرومر نے ایک رپورٹ لکھی جس میں بتایا کہ

> "پین اسلام ازم کا عمومی طور پر یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان متحد ہو کر عیسائی طاقتوں کا مقابلہ کریں------ نیز یہ کہ یہ تحریک ان اصولوں کی بنیاد پر جو ایک ہزار سال پہلے بدوی سوسائٹی کے لئے بنائے گئے تھے' اسلام کا احیا چاہتی ہے۔"

اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے آکسفورڈ کے معروف مستشرق پروفیسر ماگلیوتھ نے لکھا تھا:۔

> "گزشتہ ایک ہزار سال سے اسلام اپنے دشمنوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس لئے موجودہ وقت پر ان نعروں کو گیدڑ بھبکیوں سے زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔" ۱

وقت کی ستم ظریفی دیکھئے' اس رپورٹ کے تقریبا" پچاس سال بعد جب ۱۹۵۶ء میں جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لیا' تو مصر کو اینگلو فرنچ جارحیت کا سامنا کرنا پڑا' اس جارحانہ حملے سے پہلے برطانیہ کے وزیر اعظم ایڈن نے مغربی رہنماؤں کو عبدالناصر کے عرب نعرۂ وحدت' سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا:۔

> "کیا ہم عربوں پر کہ وہ جرمنوں کی بہ نسبت زیادہ معقول ہیں' اعتماد کر سکتے ہیں۔ فرض کیجئے اگر عرب وحدت دوبارہ ٹوٹ بھی گئی' جیسا کہ پہلے خلفاء کے عہد میں ہوا تھا۔ تب بھی یہ وحدت بربادی کا سبب بنے گی۔
>
> مختصر یہ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر ناصر کو ۱۸ قوموں کے فیصلے کو ٹھکرانے کی اجازت دی گئی' تو پٹرول پیدا کرنے والے ملکوں میں انقلاب کے شعلے بھڑکنے سے پہلے ہی چند ماہ میں مغرب کو مکمل طور پر مشرق وسطی کے پٹرول سے محروم کر دیا جائے گا۔" 2

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مسٹر ایڈن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انہیں ایک عرب ملک کے وزیر اعظم نے مصر پر حملے کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ امت مسلمہ سیاسی وحدت

کی راہ میں پیش آمدہ مسائل سے تغافل نہیں برت سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ کا بنیادی پیغام کیا ہے؟ اور موجودہ وقت میں اس وحدت سے کیا مراد ہے؟ نیز امت مسلمہ اور دوسری قوموں کے درمیان باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ امت کو ہمیشہ سے اس بات کا بجا طور پر احساس رہا ہے کہ اسے تاریخ میں اپنا ایک رول ادا کرنا ہے' جس کی خاطر اسے منصۂ شہود پر لایا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اس کردار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"ہم نے تمہیں "امت وسط" ہونے کا درجہ عطا فرمایا' تاکہ تم (اپنی بلند سیرت کی بناء پر) تمام انسانوں کے لیے (سچائی کی) گواہی دینے والے ہو اور تمہارے لیے اللہ کا رسولؐ گواہی دینے والا ہو۔" (۲:۱۴۳)

"امت وسط" کی تفسیر و تشریح میں کہا گیا ہے کہ یہ امت ایک بہترین اور متوازن امت ہے' جو افراط و تفریط سے دور رہتی ہے' ماضی میں یہ امت یہودیت اور نصرانیت کے غیر متوازن نقطہ نظر سے الگ رہی' اور عہد جدید میں زندگی کے بارے میں کمیونزم اور سرمایہ دارانہ غیر متوازن نقطہ نظر سے۔

قرآن مجید کی رو سے اس امت کے بنیادی فرائض یہ ہیں:

۱۔ یہ امت نیکی کی تلقین اور بدی سے اجتناب کا درس دیتی ہے۔ (ق 3:110)

۲۔ وہ نیکی کے کاموں میں دوسروں سے (خواہ ان کا کوئی بھی عقیدہ ہو) تعاون کرتی ہے اور پاپ' اور برائی میں کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ (ق 5:2)

رسول کریمؐ اپنی نبوت سے پہلے مکہ کے ایک معزز شہری عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ایک تاریخی اجتماع میں شریک ہوئے تھے۔ اس اجتماع میں شریک ہونے والے حضرات نے عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ہر مظلوم کی خواہ وہ کوئی ہو' امداد کریں گے۔ یہ معاہدہ آج "حلف الفضول" کے نام سے معروف

ہے۔ رسول کریمؐ نے مقام نبوت پر فائز ہونے کے بعد ایک دفعہ فرمایا:۔

"حلف الفضول کا یہ معاہدہ مجھے سرخ اونٹوں سے زیادہ عزیز ہے' اگر آج بھی کوئی مجھے اس معاہدے کی طرف بلائے تو میں اس پر (دستخط) کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

۳۔ سوسائٹی میں مکمل عدل و انصاف کا قیام۔

علمائے اسلام نے کہا ہے کہ دنیا میں پیغمبروں کی آمد کا ایک بنیادی مقصد سوسائٹی میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ قرآن مجید نے عدل و انصاف کی بار بار تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"لا یجر منکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی"

"اور (دیکھو) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو' (ہر حال میں) انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔" (ق 8:5)

۴۔ امت مسلمہ نہ صرف تمام مسلمانوں کے درمیان اخوت و مساوات کا عقیدہ رکھتی ہے' بلکہ وہ تمام بنی نوع انسان کو بھائی بھائی تصور کرتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللھم! اشھد ان العباد کلھم اخوۃ" خدایا! گواہ رہنا' بے شبہ (تیرے) تمام بندے بھائی بھائی ہیں۔ (ابو داؤد) آنحضرتؐ نے ایک دوسری حدیث میں فرمایا: "الخلق عیال اللہ احبھم ابرھم لعیالہ" تمام بندے خدا کا کنبہ ہیں۔ ان میں سے (اللہ کی نگاہ میں) عزیز ترین وہ ہے' جو اس کے کنبے کے لیے زیادہ بھلائی کرنے والا ہے (مشکوۃ)۔

عبادت بہ جز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

امت اسلامیہ کے بنیادی فریضے کی جو تفسیر و تعبیر ہمیں پیغمبر اسلامؐ کے

اسوۂ حسنہ سے ملتی ہے' اس سے یہ بات عیاں ہے کہ یہ پیغام پوری انسانیت کے لئے ہے اور اس میں نفرت' تشدد اور انتہا پسندی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان انسانی جماعت کی بھلائی کے لئے دوسری امن پسند جماعتوں اور قوموں کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں اور پر امن بقائے باہمی کے اصول پر ان کے ساتھ معاہدے بھی کرسکتے ہیں' کیونکہ مسلم اور غیرمسلم کے باہمی تعلق کی نوعیت جنگ کی نہیں' امن کی ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ بہ قول ابن تیمیہ تمام انسانوں کا بھلا چاہتی ہے۔ ("نحن قوم نحب الخیر للجمیع")

جنگ کا سبب جیسا کہ قرآن مجید نے فرمایا ہے :اسلام کا انکار نہیں' جارحیت ہے۔ چنانچہ ہر آدمی یا گروہ کو امن و آشتی کے ساتھ اپنا نقطہ نظر رکھنے اور بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح دوسرے آدمی کو اس رائے کو قبول یا رد کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ آنحضرتؐ اور اہل مکہ کے درمیان تصادم کا سبب اہل مکہ کا جارحانہ طرز عمل تھا' جو پیغمبر اسلام کو اپنی رائے رکھنے اور اس کے اظہار سے جبراً" روکتا تھا اور انہیں بہ زور اپنے پرانے دین و مذہب میں واپس لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی معاندانہ طرز عمل کے ہاتھوں پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو کئی سال تک برابر دکھ اٹھانے پڑے۔ قرآن مجید اور رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ نے مسلمانوں کو برابر یہ تلقین کی ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں' اور "زہر غم" خواہ رگ و پے میں اترتی کیوں نہ گیا ہو۔ مسلمانوں کو ہر قیمت پر صبرو تحمل' عفو و کرم اور عدل و انصاف کا ساتھ دینا ہو گا'

یہ ٹھیک ہے کہ تاریخ میں بعض مسلم حکمرانوں نے اپنے فرائض منصبی سے تغافل برتا اور انہوں نے اخلاقی روایات کو پامال بھی کیا' لیکن امت مسلمہ کے اجتماعی ارادے نے ہمیشہ تشدد' نفرت اور انتہا پسندی کی ہر آواز کو مسترد کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم جماعت جس ملک میں بھی گئی' وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ مل جل کر اس کے دکھ' سکھ میں شریک رہی اور امن و آشتی کے ساتھ

زندگی بسر کرتی رہی۔ دسویں صدی عیسوی میں معروف مسلم مورخ المسعودی نے ہندوستان کا دورہ کیا اور لکھا:-

"مسلمان امن و آشتی اور عزت کے ساتھ ایک ہندو راجہ کی ریاست میں رہتے ہیں۔ یہ راجا اپنے انصاف اور سخاوت میں معروف ہے۔"

مسعودی مزید لکھتے ہیں:-

"پورے سندھ اور ہند (بھارت) میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہے، جو گجرات کے راجا بلھرا سے زیادہ مسلمانوں کی عزت و تکریم کرتا ہو۔ اس کی بادشاہی میں اسلام مضبوط اور محفوظ ہے۔ (عزیز، مصون)۔ یہاں مساجد جو نمازیوں سے پر رہتی ہیں، آباد ہیں۔ راجا چالیس یا پچاس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ حکمرانی کرتا ہے۔ اس کی بادشاہی میں رہنے والی رعایا کی رائے ہے کہ راجا کی طویل حکمرانی کا سبب، اس کا انصاف اور مسلمانوں کی عزت و تکریم ہے۔"

مسعودی اور دوسرے مسلم مورخین نے لکھا ہے کہ ہندو ریاست میں مسلمانوں کے نظم و نسق کا سربراہ ایک مسلمان ہوتا ہے، جو شریعت کے مطابق مسلمانوں کے فیصلے کرتا ہے۔ 3

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں آں حضرت علیہ الصلاۃ والسلام کی اجازت سے مسلمانوں کی ایک جماعت اہل مکہ کے تشدد اور معاندانہ رویہ سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر گئی تھی۔ حبشہ میں اس وقت ایک منصف اور عادل، نصرانی بادشاہ کی حکومت تھی۔ چنانچہ اس نے کھلے دل سے مسلم جماعت کی پذیرائی کی اور مسلمان وہاں امن و آشتی سے رہے اور جب اہل مکہ کے ایک وفد نے حبشہ پہنچ کر بادشاہ کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے

کی کوشش کی، تو اسے ناکامی ہوئی۔ چنانچہ یہ مسلمان ایک غیر مسلم انصاف پسند بادشاہ کی مملکت میں رہے اور اس کی سیاسی سیادت کو (Sovereignty) کبھی چیلنج نہیں کیا۔ بلکہ آج تک ہماری تاریخ حبشہ اور اس کے بادشاہ کے تاریخی موقف کا اعتراف کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ ایک غیر مسلم لیکن عادل حکمران ایک ظالم مسلم حکمراں سے بہتر ہے۔

عہد حاضر میں امت مسلمہ کی وحدت کا سوال

بے شبہ اسلام ایک ایسی آفاقی سوسائٹی کی تشکیل کرنا چاہتا ہے، جو رنگ، نسل، زبان اور وطنیت سے بالا تر ہو کر تمام انسانوں کی روحانی اور مادی بھلائی کے لئے کام کرتی ہے۔ لیکن اسلام خلاء میں ایک خیالی مثالی ریاست (Uthopia) قائم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ چنانچہ وہ معاشرے میں کام کرنے والے عوامل اور محرکات سے کبھی تغافل نہیں برتتا، مثلاً زبان اور نسل کی وحدت نے انسانی سوسائٹی میں ہمیشہ موثر کردار ادا کیا ہے۔ قرآن مجید نے زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انسانی بولیوں اور رنگوں کے اختلاف و کثرت کو بھی خدائی نشانیوں میں شمار کیا ہے (الروم:22) چنانچہ ریاست کی انتظامی وحدتوں کو لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر استوار کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری بھی ہے۔ آج انسانی تجربہ، مشاہدہ اور تاریخ و سیاست کا شعور سیاسی استحکام میں صحت مند اور موثر کردار ادا کر رہا ہے، اس لئے مسلم امت کی وحدت کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ ہر مسلم ملک اپنے اپنے حالات و ظروف کے مطابق دستوری، جمہوری اور اخلاقی بنیادوں پر ایک مضبوط حکومت قائم کرے، جسے لوگوں کی مکمل حمایت حاصل ہو، اگر ایک ہی ملک میں مختلف زبانیں اور نسلیں آباد ہیں، تو انتظامی وحدتوں میں ان کا برابر خیال رکھا جائے۔ چنانچہ دولت مشترکہ کی طرز پر مسلم امت کی متعدد وحدتوں کو ایک نظام میں لایا جا سکتا ہے، جسے آج کی

زبان میں Confederation کہہ سکتے ہیں۔ جمال الدین افغانی نے کہا تھا کہ تمام مسلمان----- خواہ ان کی کوئی زبان یا ملک ہو' قرآن مجید کو خدائی کلام اور اس کی سیادت کو مانتے ہیں' اس لئے مسلمان ملکوں کو' جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے' وحدانی حکومت کی بجائے کنفڈریشن قائم کرنی چاہیے۔

سویزرلینڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے' جہاں بنیادی طور پر چار زبانیں بولی جا رہی ہیں اور ہر زبان اور نسل کو مساوی درجہ حاصل ہے' یا آج یورپ کے مختلف ملک متعدد زبانوں اور کلچر رکھتے ہوئے ایک مشترکہ مفاد کی خاطر متحدہ یورپ کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اسی طرز پر مسلمان ملکوں کو ایک دولت مشترکہ قائم کرنی چاہیے' جو اخلاقی اور روحانی اصولوں پر اپنے شہریوں کے لئے ایک باوقار' بامقصد اور خوش حال زندگی بسر کرنے کے لیے کام کرے اور اخلاقی بنیادوں پر ایسا منصفانہ سیاسی اور معاشی نظام قائم کرے' جو آج کے خالص سرمایہ دارانہ نظام سے الگ ہو۔ یہی نظام ہے' جس کی وجہ سے اس صدی میں پوری انسانی جماعت کو دو عالمی جنگوں سے واسطہ پڑا۔ مرحوم محمد حسین ہیکل نے اپنی معروف کتاب "الفاروق عمرؓ" میں لکھا ہے کہ کیا حضرت عمرؓ نے چاہا تھا کہ عرب دنیا کے لیے ایک مفصل نظام قائم کریں' یا عراق اور شام میں ایرانی یا رومی نظام سے ملتا جلتا نظام جزیرۃ العرب میں رائج کریں؟ ہماری رائے میں ایسا خیال ان کے دل و دماغ میں نہیں آیا۔ کیوں کہ جزیرۃ العرب بنیادی طور پر عراق و شام سے مختلف تھا۔ عرب جس زندگی کے عادی تھے' وہ ایرانی حکومت کی مرکزیت یا رومی نظام حکومت سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ .... اگر وہ (حضرت عمرؓ) تمام ملکوں میں ایک ہی نظام کو رائج کرنے کی کوشش کرتے تو اس کے نتائج سے وہ خود یا مسلمان خوش نہ ہوتے.... چنانچہ ہم عہد حاضر میں بین الاقوامی قانون کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظام امریکہ یا سویزرلینڈ کی متحدہ ریاستوں سے ملتا جلتا نظام تھا۔" (4) چنانچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ: حضرت عمرؓ

نے جو نظام حکومت قائم کیا تھا' اسے آج کی زبان میں "کنفڈریشن" (Confederation) یا فیڈریشن سے تعبیر کرسکتے ہیں' جہاں ہر قبیلہ ملی مرکز کا وفادار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی امور میں آزاد تھا۔ اسلامی ریاست شاید پہلی ریاست ہے' جہاں دوسری مذہبی جماعتوں کو مذہبی خود مختاری حاصل تھی اور وہ قرآن مجید کے فرمان کے مطابق اپنے مذہبی مسائل کے لیے اپنی خود مختار عدالتیں رکھتے تھے۔ اگر آج مسلم یا عرب ریاستیں مذہب اور سیاست میں اپنی تاریخی روایات اور رواداری سے کام لیتیں' تو عراق میں کردوں اور جنوبی سوڈان میں عیسائیوں کے مسائل سر نہ اٹھاتے۔ ان گروہوں کے لسانی اور مذہبی مسائل کو ان کی تمناؤں کے مطابق حل کر کے ہی ریاست کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جاسکتا ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ سوسائٹی میں کام کرنے والے عوامل کا جب کبھی انکار کیا گیا' ریاست میں انتشار پسند طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔ مثلاً پاکستان میں بنگالی زبان سے تغافل برتنا' یا بنگالی ادب کی تاریخ میں ٹیگور جیسے ادیب و مفکر کو نظر انداز کرنے کی سعی ناکام' (5) ایسے ہی مغربی پاکستان میں طبعی عوامل کا انکار' اس طرز فکر نے ہماری سوسائٹی میں ایک منفی کردار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن خلدون نے ریاست کے استحکام کے لیے عقیدے اور عصبیتہ (National feelings) دونوں کو ضروری قرار دیا ہے۔

رہے وہ ممالک جہاں پر مسلمان اقلیت میں ہیں' اور اپنے اپنے ملکوں کی سیاسی و معاشی زندگی میں مقدور بھر اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ امت مسلمہ ان کے روحانی اور اخلاقی ارتقا کے لئے ایک مربوط اور ٹھوس پروگرام بنا سکتی ہے' لیکن یہ ایک نازک مسئلہ ہے' اس لیے اس پروگرام کو ہر قسم کی فرقہ وارانہ سیاست سے یک قلم دور رہنا ہوگا اور مسلمان عہد حاضر کے علوم اور اپنی تاریخی روایات۔ رواداری' انسان دوستی' سچائی اور اخلاق فاضلہ سے لیس

ہو کر ایک نئے ولولے' جذبے اور اخلاص سے اپنے معاشروں اور اپنے ہم وطنوں کی مادی فلاح و بہبود مین بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتے ہیں۔

آخر میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ موجودہ وقت میں ہم مسلم اور غیر مسلم معاشروں میں ہر قسم کی لسانی' ثقافتی' مذہبی اور سیاسی فرقہ واریت اور انتہا پسندی سے الگ رہ کر ہی کام کر سکتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ زندگی کی بلند قدروں کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ہم پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کریں۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ ہمارے پاس ایک بلند مقصد ہو اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وسائل بھی بلند اور پاکیزہ ہوں اور اپنے دامن کو تشدد' نفرت اور فرقہ واریت کے ہر دھبہ سے پاک رکھیں' ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے کبھی کبھار کانفرنس یا سیمینار منعقد کر لینا کافی نہیں ہے' ہمیں اپنے افکار و خیالات کی تبلیغ کے لئے تالیف و تصنیف کا سلسلہ بھی شروع کرنا چاہیے۔ اسلام اور عصر حاضر کے تمام مسائل پر معروضی نقطہ نظر سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

مرحوم ڈاکٹر فضل الرحمان کا کہنا تھا کہ آج کل مسلم جماعت میں دو بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں:-

۱۔ ان میں نہ تو خیالات کی صفائی (Clarity of thought) ہے اور

۲۔ اور نہ ہی طرز بیان میں صفائی (Clarity of expression) ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری ساری توانائیاں بے ہنگم جوش و خروش کی نذر ہو رہی ہیں۔ اس لئے وقت آگیا ہے کہ ہم اختصار اور خوب صورتی سے اسلام اور ریاست' مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات' دور حاضر میں انسانی تہذیب و تمدن میں ہمارا کردار اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر سنجیدگی سے لکھیں نیز ہمیں ان انتہا اور تشدد پسندانہ خیالات کا بھی جائزہ لینا چاہئے' جنہیں آج دنیا کے سامنے اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام

کے آفاقی پیغام کو ایک "سیاسی منشور" بنا کر رکھ دیا ہے اور دین کو اس کے بلند مقام سے اتار کر اسے "سٹیٹ یا ریاست" کے دائرہ میں محدود کر دیا ہے۔ چنانچہ امت کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسے اپنے تاریخی کردار کا شعور ہو اور اس کردار کو ادا کرنے کے لیے اسے عالمی سٹیج پر ایک اخلاقی جماعت کی حیثیت سے آنا ہوگا' یہ بات تبھی ممکن ہے (1) کہ وہ آسمان سے اپنے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو بحال کرے۔ اس طرح اسے نفرت' حسد' لالچ' جھوٹ اور غرور و پندار جیسی مہلک معنوی بیماریوں سے نجات ملے گی۔ کیوں کہ "عبادت ایک ایسا مقدس جہاز ہے جو موت و حیات کے سفر میں اپنا بوجھ اٹھائے ساحل اور روشنی کی خامشی کی طرف بڑھتا ہے۔"

(2) امت کو اپنے معاشروں کو مکمل عدل و انصاف کی بنیادوں پر اٹھانا ہوگا۔ رشوت' کام چوری' کرپشن کو ختم کر کے ہی معاشرے میں امن و آشتی اور عدل و انصاف کو واپس لایا جاسکتا ہے۔ یہ کام ایک مثبت اور مربوط پروگرام کے تحت اخلاص' سنجیدگی' سعی پیہم سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔

(3) ہر مسلم ملک اپنے معاشی اور سیاسی مسائل کو سلجھانے کے بعد ہی مسلم دولت مشترکہ کے قیام کے لیے کام کرسکتا ہے۔ مسلمانوں کی دولت مشترکہ کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ دوسری امن پسند قوموں اور جماعتوں کے ساتھ ملکر امن و آشتی اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے' چنانچہ امت مسلمہ کی وحدت یا اتحاد دوسرے ملکوں یا قوموں پر اپنا سیاسی یا اقتصادی تسلط قائم کرنے کے لیے نہیں' بلکہ انسانی وقار کو بحال کرنے اور انسان کو فقر و فاقہ اور جنگ کے خوف و ہراس سے نجات دلانے کے لیے ہے۔ چنانچہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی علمی اور عملی سرگرمیوں سے اپنے معاشرے کے صحیح خدوخال کو دنیا کے سامنے واضح کریں اور بتائیں کہ ہم جس خدائی مملکت کے قیام کی تمنا رکھتے ہیں' وہ بہ قول اقبال صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ہے' بلکہ وہ جنت ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔

References

1. Pan Anglican Papers. The Mohammeden Propaganda with special reference to Pan-Islamism published by Society for Promoting Christian Knowledge. London, 1908. p.2,3. See also: *Scrutiny*, Quaid Azam, University, Islamabad, July-December issue, 1975. (Pan-Islamism; Afghani and Nasser. by Rashid Ahmad (Jullundhri) PP.27-42.)

2. The Memoirs, London, 1960 p. 466 (Full Circle)

3- مروج الذھب: قاہرہ' 1949ء' ص 170,210/1 - مرتب محمد عبداللہ' نیز ملاحظہ ہو: محمد حمید اللہ 'The Muslim Conduct of State' لاہور' 1968ء' ص 235-233

4- محمد حسین ہیکل: الفاروق عمرؓ' قاہرہ' ج 2' ص 207- نیز دیکھیے:۔
عباس محمود العقاد: عبقریۃ عمرؓ' بیروت 1969ء

5- کاردار (A.H): ناکام امیدیں (Failed Expecations)
لاہور' 1995ء' ص 33-
"جسٹس مرشد نے اس تجویز پر لکھا تھا:۔ "جناب کاردار صاحب! میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ لاہور کے تانگہ ڈرائیور کی بولی میں بات کریں گے۔ کیا آپ شیکسپیئر کے بغیر انگریزی زبان کا تصور کرسکتے ہیں؟ خدا کا نام لیجئے۔ کیا آپ ٹیگور کے بغیر بنگالی ادب کے بارے میں سوچ سکتے ہیں؟"